

اقبال اور سیکولرزم

ڈاکٹر جاوید اقبال

بقول علامہ اقبال حیات کی بنیاد اصلاً روحانی ہے۔ یہ لافانی اصول اپنے آپ کو تغیر اور مختلف نوع کی نئی صورت حالات میں ظاہر کرتا رہتا ہے۔ فرماتے ہیں، ’’ایسے معاشرے کے لیے جس کی بنیاد حقیقت کے اس اصول پر استوار کی گئی ہو، لازم ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو ثبات اور تغیر کی قدروں سے منسلک کرے۔‘‘ یہاں ثبات کی قدر سے اُن کی مراد ’عبادات‘ ہیں اور تغیر کی قدر سے مراد وہ قرآنی احکام ہیں جن کا تعلق ’معاملات‘ سے ہے۔ بالفاظِ دیگر اقبال اس تفریق کو تسلیم کرتے ہیں کہ شریعت کے اُن قوانین کی تعبیریں، جن کا تعلق ’معاملات‘ سے ہے، اصولی تغیر کے تحت، بذریعہ اجتہادی عمل، وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبدیل کی جاسکتی ہیں!

اسی پس منظر میں اقبال اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی آج کی ’روشن خیال‘ نسل یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ انہیں اسلام کے بنیادی فقہی اصولوں کی تعبیر اپنے تجربات اور جدید زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرنے کی اجازت دی جائے!

ارشاد ہوتا ہے:

روحِ نچرل (طبعی)، میٹیریل (مادی) اور سیکولر (دنیاوی) ذرائع سے اپنے آپ کے اظہار کے مواقع تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی سیکولر (دنیاوی) کی صورت میں نظر آتا ہے وہ اپنے وجود کی اصل کے اعتبار سے مقدس ہے۔ علمِ جدید نے جو سب سے اہم خدمت، اسلام ہی نہیں بلکہ درحقیقت تمام ادیان کے لیے انجام دی ہے، وہ اُن حقائق کے بارے میں اُس کا مشاہداتی تبصرہ ہے جنہیں ہم ’مادی‘ یا ’طبعی‘ کہتے ہیں۔ اس تبصرے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بظاہر جو ہمیں ’مادہ‘ کی شکل میں دکھائی دیتا ہے، اس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں جب تک کہ ہم اس کی موجودگی کو ’روح‘ کے اندر دریافت نہ کریں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ دنیا گناہوں کی گندگی سے اٹی پڑی ہے، قطعی غلط ہے۔ ’مادہ‘ کی بیکراں وسعت کا مطلب یہی ہے

کہ وہ 'روح' کی اپنی نمود اور اظہار کے لیے راہ فراہم کرتی رہے۔ پس اس اعتبار سے تمام سرزمین مقدس اور آلائشوں سے پاک ہے۔^۳

اقبال کے نزدیک مسلمانانِ عالم اُس قسم کے قبل از جدید (پری موڈرن) عہد سے گزر رہے ہیں جس طرح 'پروٹسٹنٹ' انقلاب کے دوران یورپ کا مذہبی چہرہ تبدیل ہوا تھا۔ مسیحی یورپ میں مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک، بقول اقبال، بنیادی طور پر ایک سیاسی تحریک تھی جس کے زیر اثر یورپ میں قومی ریاستیں (میشن اسٹیٹس) نمودار ہوتی چلی گئیں۔ اُس زمانے میں جن یورپی سیاسی مفکروں نے 'سیکولرزم' کا فلسفہ پیش کیا اُن میں سے بیشتر یا تو مادہ پرست دہریے تھے یا 'ایکناٹک' (لاادری)۔ انھوں نے رائج مذہبی عدالتوں کے دائرہ اختیار کو صرف کلیسا سے متعلق مذہبی عناصر تک محدود رکھنے پر اصرار کیا اور عوام الناس کو اُن کے دائرہ اختیار میں لانے کی مخالفت کی۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ اخلاقیات کے اصولوں پر صرف مسیحیت ہی کی اجارہ داری نہیں کہ اُن کی خلاف ورزی کی صورت میں جو تعزیری شکل میں سزائیں دی جائیں وہ مستقل اور غیر متبدل ہوں بلکہ اخلاقیات کے اصول دراصل انسان ترتیب دیتا ہے اور وہ جامد، مستقل یا غیر متبدل نہیں بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لہذا ریاست میں اخلاقیات کی خلاف ورزی کے سلسلے میں خدایا کلیسا کے بنائے ہوئے مستقل قوانین کی بجائے انسان کے بنائے ہوئے متبدل قوانین کا نفاذ کیا جائے۔

اس بحث کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ یورپ کی نئی قومی ریاستوں میں عالمگیر مسیحی اخلاقیات پر مبنی قوانین کے بجائے 'نیشنل' یا رائج قومی تصور اخلاقیات کی بنیاد پر انسان کے بنائے ہوئے سول اور فوجداری قوانین نافذ کر دیے گئے اور یوں ریاست اور کلیسا الگ ہو گئے۔ بہر حال اگر کلیسا کے پاس 'اجتہاد' جیسا کوئی عمل ہوتا تو عین ممکن ہے کہ عالمگیر مسیحی قوانین کی تعبیر انسانی اخلاقیات کی بدلتی ہوئی قدروں کے مطابق کی جاسکتی اور یورپ میں ریاست اور کلیسا کی علاحدگی کی ضرورت نہ پڑتی۔ بہر حال ایک مسئلہ جسے سمجھنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ 'سیکولر' یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے زیر اثر یورپی قومی ریاستوں کے شہری بحیثیت مجموعی اپنے مذہبی عقائد سے منحرف نہیں ہوئے۔ یعنی یورپ کے مسیحی معاشروں نے صرف 'معاملات' کی حد تک قانون سازی کے بارے میں 'سیکولرزم' اختیار کیا۔ جہاں تک 'عبادات' کا تعلق ہے ریاست نے کوئی مداخلت نہ کی بلکہ مسیحی فرقے اپنی اپنی روایات کے مطابق عبادت کرنے میں آزاد رہے۔ آج بھی جو صلیبی جنگ اسلام کے خلاف لڑی جا رہی ہے اس کا پس منظر کسی نہ کسی شکل میں پرانی مذہبی منافرت ہی کا اظہار ہے۔

مگر دنیائے اسلام میں علما نے یورپی 'سیکولر' ریاست کو 'لادین' یا 'بے دین' ریاست قرار دیا جس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ ایسی ریاست کے شہری بھی مذہبی عقائد سے لائق یا مذہب کے مخالف ہو گئے ہیں لہذا جب ترکی نے 'سیکولرزم' کو بطور قومی نظریہ قبول کیا تو اس کی مذمت کی گئی کہ لادین ریاست کے شہری

ہونے کے سبب ترک قوم اسلام سے منحرف یا مرتد ہو گئی ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ ترکوں نے 'معاملات' کی حد تک شریعت کے قوانین کی بجائے 'سیکولر' قوانین کا نفاذ قبول کیا۔ جہاں تک 'عبادات' کا تعلق ہے ترک تب بھی مسلمان تھے اور اب بھی مسلمان ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو آج کوئی بھی ریاست جو 'سیکولر' ہونے کا دعویٰ کرتی ہے دراصل لادین یا مذہب کی مخالف نہیں (ماسوا سابق سویٹ یونین کے جہاں دہریت کو ریاستی پالیسی کی حیثیت سے عوام پر نافذ کیا جاتا تھا) لیکن یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آج کی 'سیکولر' ریاست سے مراد ایسی نظریاتی ریاست ہے جو مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار ہو، 'عبادات' کے ضمن میں ہر شہری کو مذہبی آزادی فراہم کرے اور تمام شہریوں میں کسی امتیاز کے بغیر برابری کے اصول کو رائج کرے۔ کیا یہی وہ اصول نہیں جس کی جھلک علامہ اقبال کے اس قول میں دکھائی دیتی ہے کہ اسلام کا اصل مقصد 'روحانی جمہوریت' کا قیام ہے؟

جہاں تک پاکستانی مسلمانوں کا تعلق ہے 'سیکولرزم' پر بحث کی ایک اور اہم جہت بھی ہے جس پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا شریعت کے ایسے قوانین جن کا تعلق 'معاملات' سے ہے، پر ایمان ایک مسلمان کے عقیدے کا حصہ ہیں؟ سوال کا جواب اس شکل میں دیا جاسکتا ہے کہ مسلم اکثریتی ریاستوں میں اسلامی اخلاقیات کے نظام کا انعقاد بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے شریعت کے سول اور فوجداری قوانین جن کا تعلق 'معاملات' سے ہے، وہ مسلمانوں کے ایمان کا حصہ تصور کیے جائیں گے۔ ترکوں کے 'معاملات' کے سلسلے میں شریعت کے قوانین کی بجائے 'سیکولر' قوانین کے نفاذ پر علما کا اعتراض اس اعتبار سے درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی اسلامی یا مسلم ریاست کے مسلمان یہ تقاضا کریں کہ شریعت کے قوانین وقت کی جدید ضروریات کے تحت ایک نئی تعبیر کے محتاج ہیں، تو کیا انہیں اسلام سے منحرف، مرتد یا کافر قرار دیا جائے گا؟ اقبال کے نزدیک 'معاملات' سے متعلق تمام شرعی احکام کی تعبیر، قانون تعبیر کے بنیادی اصول کے تحت، اجتہادی عمل کے ذریعے، وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق، پارلیمنٹ میں قانون سازی یا عدلیہ کے فیصلوں سے کی جاسکتی ہے۔ البتہ بقول اُن کے، غیر اسلامی طاقتوں کے تسلط کے دوران اور تنزل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر علما نے مسلم امہ کے تحفظ کی خاطر شرعی قوانین کی تعبیر کے سلسلے میں جدت پسندی کے فروغ کو روکا، تو ان حالات کے تحت یہ عمل درست تھا، مگر اب آزاد اسلامی ریاستوں کے مسلمانوں کے لیے پیچھے کی سمت جانا ممکن نہیں۔ پس اگر ہم نے انڈھی تقلید کا پرانا رویہ ترک نہ کیا اور معاملات یا اخلاقیات کے بارے میں احکام کی انہی تعبیروں سے چٹے رہے جو ماضی کے فقہانے اپنے اپنے ادوار کی ضرورتوں کے مطابق مرتب کی تھیں، تو شریعت کی ایسی تمام تعبیریں مع آئمہ کے آپس میں شدید اختلافات، پیچھے رہ جائیں گی اور مسلمان وقت کی رو میں بہتے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ یعنی علما کی تنگ نظری اور فقہی مدارس کے گہرے اختلافات مبادا

انھیں مجبوراً ہر مسلم قوم کے اپنے تمدنی اور اخلاقی نقطہ نگاہ کے مطابق، بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر انحصار کرنا پڑے۔ اقبال کے نزدیک فی الحال مسلم ریاستوں کی باگ ڈور اوسط درجے کے قائدین اور سوچنے سمجھنے سے عاری مسلم عوام کے ہاتھوں میں ہے اور ایسی ذی فہم اور بلند پایہ شخصیتیں موجود نہیں جو قیادت فراہم کر سکیں۔ اسی بنا پر وہ متنبہ کرتے ہیں: ۵

ہمارے آج کے علماء یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی قوم کی تقدیر کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اُسے کسی نہ کسی اصول کے تحت مستقل طور پر منظم رکھا جائے، بلکہ اس بات پر ہے کہ قوم کس قسم کی قابل اور طاقتور انفرادی شخصیتیں پیدا کر سکنے کی اہل ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں محض تنظیم ہی پر زور دیا جائے، فرد کی اہمیت کلی طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ فرد اپنے گرد و نواح کے معاشرتی فکر کی دولت تو حاصل کر لیتا ہے، مگر وہ اپنی فطری اجتہادی روح گنوا بیٹھتا ہے۔ پس اپنی گزشتہ تاریخ کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیا کسی قوم کے زوال کو نہیں روک سکتے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ ایسے نظریات جنہیں کسی قوم نے خود متروک قرار دیا ہو، اُس قوم میں کبھی قوت حاصل نہیں کر سکتے۔ کسی قوم کے زوال کو روکنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے وہ خود شناس افراد کی پیدائش، پرورش اور حوصلہ افزائی ہے۔ ایسی شخصیتیں ہی زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف کرتی ہیں اور ایسے نئے معیار دریافت کرتی ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ ہمارے گرد و نواح دائمی نہیں بلکہ بدلے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

حوالے اور حواشی

- ۱۔ تشکیلی جدید، ۱۹۸۲ء، ایڈیشن، ص ۱۴۷۔
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸۔
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۵۵۔
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔
- ۵۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔